ڈاکٹر عبدالرحیم ملا۔
HOD. of Urdu, MGVC Arts. Com & Science College, Muddebihal Dist. Vijayapur, Karnataka

محبّ کوثر بحیثیت غزل گوشاعر

شاعری قدرت کا عطا کردہ ایک بے بہا عطیہ ہے۔ جو سب کو نہیں چند ہی کو عطا ہوتا ہے۔ لیکن ان چند لوگوں میں بھی شرف چند ہی ایسے ہوتے ہیں۔ جو اس سے بھرپور استفادہ کرتے ہیں۔ کسی شاعر کا اس سے استفادہ کرنا یعنی شاعری کو بروے کار لانا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ اس ودیعت کا احترام کرتا ہے۔اور شعر کہہ کر اس بار امانت سے سبکدوش ہوتا ہے۔ جو قدرت نے اسے بخشی ہے۔

شاعری کرنا اور اشعار کا مجموعہ شائع کرنا اگر چہ دو مختلف عمل ہیں۔ پھر بھی یہ کوئی نیا عمل، نئ بات نہیں، ہر شاعر کی آرزو ہوتی ہے کہ اس کا کلام جو اسکی زندگی کے ہر لمحہ سے جڑا ہوا ہوتا ہے۔خلوتوں اور محفلوں سے نکل کر کتاب کی صورت میں منظر عام کی شاہراہ تک پہنچے۔محبّ کوثر کا یہ دوسرا شعری مجموعہ، ''سود وزیاں اسی جذبہ کا ردِ عمل ہے۔ جو پہلے شعری مجموعے کے بعد ارتقا کی دوسری منزل ہے۔''

محبّ کوثر نے صنف غزل کو اپنی فکر کا موضوع بنایا ہے۔ وہی غزل جو اردو کی آبرو ہی نہیں اسکی زندگی بھی ہے۔ غزل کی اہمیت کا تجزیہ فراق نے ایک انوکھے پیرایہ میں کیا ہے۔ لکھتے ہیں کہ غزل کی شاعری ایک مہذب رچی ہونی بیکاری ہے۔ لیکن شاید ایسی بیکاری جو فلسفۂ تمدن کی روح ورواں بن سکتی ہے۔ کیوں کہ غزل میں جو لپیٹ اور سمیٹ ہوتی ہے۔ اس کے اسلوب میں منتشر حقائق کو جامعیت وآہنگ کے ساتھ دل کی گہرائی میں اتارنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔

محبّ کوثر اسی غزل کے شاعر ہیں دور حاضر کے تغزل کی خصوصیتوں میں معنویت سنجیدگی وقوف جذبات اور حسن وعشق کے احساس کے ذریعہ وحیات وکائنات کی نئی تنقید اور اس سے متعلق نئے اشارات

قابل ذکر ہیں۔ ''سودوزیاں'' کے شاعر نے عام شاعروں کی طرح اپنی غزل کا آغاز روایتی طور پر کیا ہوگا۔لیکن اس وقت جو مجموعہ ہمارے سامنے ہے وہ یہ خوشگوار انکشاف کرتا ہے کہ محبّ کوثر نے روایتی فرسودگی سے گریز کرتے ہوئے نئی غزل کے آنگن میں قدم رکھا ہے اور نئے پن کے احساس سے اپنا رشتہ جوڑا ہے۔

ہر شاعر دوسرے ہمعصر شاعروں سے مماثلت رکھتے ہوئے بھی ایک جدا گانہ طرز کا حامل ہوتا ہے۔ چنانچہ محبّ کوثر جب اپنے مخصوص انداز میں غزل کے عشقیہ یا دیگر موضوعات کو برتے ہیں تو خواہ وہ ہمکو وادیٔ گل کی ٹھنڈی چھاؤں میں لے جائیں یا صحرائی تپتی دھوپ کی سیر کرائیں، ہر دوصورتوں میں ان کا اظہار اپنا ذاتی ہوتا ہے۔

ڈاکٹر علی احمد جلیلی محبّ کوثر کا شعری مجموعہ سودوزیاں کو منظر عام پر لائے تو وہ انکے متعلق لکھتے ہیں کہ محبّ کوثر ایک مخلص شاعر کے روپ میں ہمارے سامنے آتے ہیں۔ مضامین کا تنوع اس بات کی دلیل ہے کہ کلاسیکی رچاؤ کے ساتھ ان کی شاعری عہد حاضر کے بدلتے ہوئے تہذیبی وتمدنی رویوں کی کشمکش سے بھی ہم آہنگ ہے۔ جہاں گیسوؤں کے سایے اور رخساروں کی چاندنی ہے۔ وہیں وقت کے شور اور شر اور اسکی کربنا کیوں کہ دھوپ چھاؤں بھی ہے یعنی عصری تقاضوں سے ان کے قلم کا رشتہ استوار ہے۔ یہی سبب ہے کہ غم ذات کم، غم کائنات زیادہ ہے۔

پڑوسی کے مکاں میں آگ کے شعلے بھڑکتے ہوں
تماشا دیکھ کر یوں ہی گزر جانا نہیں آتا

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہر وہ تجربہ جس سے شاعر دوچار ہوا ہے وہ اسکے قلم سے صفحۂ قرطاس پر بکھر گیا ہے۔ لیکن تجربہ کی تلخیاں اور محرومیاں شاعر کو اپنے شکنجہ میں لیکر اسے ریزہ ریزہ نہیں کرڈالتی بلکہ اسے تن کر کھڑا ہونے کا حوصلہ بخشی ہے۔

اندھیرے تم نے بڑھائے تو غم نہیں یارو
میں ہر قدم پہ نئے آفتاب رکھتا ہوں

جہاں تک غزلوں کی لفظیات کا سوال ہے۔ فکر وخیال اور جذبات وتجربات کی مناسبت سے محبّ کوثر نے غزل کی موروثی زبان کے ساتھ اپنی نئی ترکیبیں بھی تراشی ہیں۔ نئے استعاروں کو جنم دیا ہے تا کہ خیال کہ اظہار میں ان کے معاون ہوں، یہ علامتیں کچھ اس نوعیت کی ہیں۔ مثلاً قتیل وقت، زندگی کا

صحرا، سلگتی شام ہوس کی چنگاری غموں کی دھوجپ، درد کی انگڑائیاں، جہل کا برادہ، خلوص کے تیور تہمت آوارگی، زخموں کا لبادہ، جھیل کے سایے، سوچوں کا سمندر تعمیر کا سورج ذہن کے دریچے اور کانٹوں کا مزاج وغیرہ ان کو لیکر جب وہ آگے بڑھتے ہیں تو ان کا بہاؤ یوں ہوتا ہے۔

''جھانکتی ہے مایوسی ذہین کے دریچوں سے سوچ کے مکانوں کی کھڑکیاں بدل ڈالو تمہاری یاد کے سایے بھی اب نہیں ملتے غموں کی دھوپ ہے دہرا عذاب رکھتا ہوں آگہی کے متوالے دوستو کے ذہنوں میں جہل کا برادہ ہے یہ بھی ہم سمجھتے ہیں الفاظ کے دریا سے کہہ دینا سنبھل جاتے سوچوں کے سمندر میں طوفان مکمل ہے۔''

ایک اور قابل ذکر خصوصیت یہ کہ محبّ کوثر نے غزل کی پامال اکتا دینے والی زمینوں کو نظر انداز کرتے ہوئے زیادہ تر نئی زمینوں سے کام لیا ہے۔ یہ زمینیں ان کو اپنی ایجاد کردہ ہیں اور ان کے اسلوب میں نئے پن کا احساس دلاتی ہیں۔ مثلاً

مہر وفا خلوص نصابوں میں قید ہے
انسانیت تو صرف کتابوں میں قید ہے
ہر سمت بغاوت کا اعلان مکمل ہے
کیا اہل سیاست کا فرمان مکمل ہے
کہتا ہے کون درد کے آنسو سمیٹ لے
آنکھوں میں انتظار کے جگنو سمیٹ لے
بکھر گئے ہیں فضاؤں میں پیاس کے ٹکڑے
زمانہ جوڑ رہا ہے گلاس کے ٹکڑے

یہ تجربہ جاذب نظر تو ہے لیکن اس کوشش میں کئی زمینیں اپنے ردیف وقوانی کے تال میل کے سبب ایسی سنگلاخ ہوگئی ہیں کہ قافیہ پیمائی کو نوبت آگئی ہے۔ مجموعی طور پر اس شاعری میں جذبات کی روانی کے ساتھ تفکر کی صلاحیت بھی ہے پھر یہ کہ شاعر نے خود کو اپنی ذات کی حد بندیوں میں نہیں الجھایا ہے۔ بلکہ اجتماعی نقطہ نظر کو اپنایا ہے۔ تقلید کے بجائے خود اپنی ذہانت سے کام لیا ہے۔

پدم شری حضرت بیکل اتساہی، سابق یم۔پی۔ (راجیہ سبھا) ''دکن کا البیلا شاعر'' عنوان پر

لکھتے ہیں۔غزل کے بارے میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔لکھا جا رہا ہے۔لکھا جا تا رہے گا۔لیکن اب تک کوئی ایسا معیار متعین نہیں ہو پایا۔جس کے بارے میں یہ کہا جا سکے کہ جب تک اس معیار پر غزل نہ ہو غزل،غزل کہلانے کی حقدار نہیں۔ ہر ناقد نے اسے اپنی نظر سے دیکھا اور ہر شاعر نے اسے اپنے مزاج کے مطابق سجا یا کبھی یہ دلّی کی ترجمان بنی تو کبھی حکیمانہ اور صوفیانہ خیالات کی آماجگاہ تو کبھی اسے ذہن و شعور عطا کیا گیا بعض ناقدین نے کبھی غزل کو قابل گردن زدنی کہا اور کبھی آبروئے شاعری، اتفاق اور اختلاف کا یہ سلسلہ ہمیشہ ہی سے چلتا آرہا ہے۔مگر غزل ان سب سے بے نیاز ہوکر اپنی منزل کی طرف کل بھی رواں دواں تھی۔اور آج بھی رواں دواں ہے میں سمجھتا ہون کہ آج کا دور غزل کی کشمکش کا دور ہے۔ ایک طرف تو ایسے لوگ ہیں۔جو روایت کی تقلید سے ذرہ برابر بھی انحراف کرنے کے قائل نہیں۔دوسری طرف وہ لوگ ہیں۔جو روایت سے انحراف ہی کو جدیدیت سمجھتے ہیں۔میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ قدیم وجدید کی حد بندی محض اختراء ہے۔یہ ایک ہی رخ کے دو پہلو ہیں۔اور دونوں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے۔

علامہ اقبالؔ نے کیا اچھی بات کہی ہے۔

زمانہ ایک ، حیات ایک ، کائنات بھی ایک
دلیل کم نظری ، قصد جدید و قدیم

غزل اردو شاعری کی عجیب وغریب صنف ہے۔عجیب وغریب میں اس لیے سمجھتا ہوں کہی یہ ہر دور کے مطابق خود کو ڈھال لیتی ہے۔اور زمانے کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے تیار رہتی ہے۔ ہر قسم کے مضامین کے لیے اس کے دروازے کھلے رہتے ہیں۔نو واردوں کا بھی یہ کھلے دل سے خیر مقدم کرتی ہے اور کہنہ مشقوں کو بھی موقع دیتی ہے کہ وہ اپنی فنکاری کے جوہر دکھلا سکیں۔

کیا میرؔ ہوں، کیا غالبؔ، کیا حالیؔ ہوں، کیا حسرتؔ موہانی ہوں، کیا فانی کیا بدایونی، کیا اصغرؔ ہوں، کیا جگر، کیا یگانہؔ ہوں، کیا فراق سب ہی غزل کی زلفوں کے اسیر نظر آتے ہیں۔ترقی پسندوں میں بھی مجازؔ مجروحؔ، فیضؔ، جاں نثار اخترؔ وغیرہ اس بات کے قائل تھے کہ غزل میں آج ارباب فن کی آزمائش ہے اور ہمارے دور میں بھی کون ہے جو غزل کی عظمتوں کا قائل نہیں۔ایشیاء کیا ساری دنیا کی یہ عظیم ترین صنف سخن ہے۔جو صرف دو ہی مصرعوں میں کم سے کم الفاظ میں بڑی سے بڑی بات کو بیان کر دیتی ہے۔اور اس کا انداز ایسا ہوتا ہے۔جو دنوں کو چھو لے اور کوئی بھی

متاثر ہوئے بغیر رہ ہی نہیں سکتا۔

رئیس المتغزلین حضرت جگر ہمیشہ اپنے چھوٹوں سے کہا کرتے تھے کہ میاں اچھے انسان بنو پھر اچھے شعر بھی کہو گے۔ محبّ کوثر ایک اچھے سے ملتے ہیں۔ اور اپنے محبانہ رویے سے اپنی طرف کھینچ لیتے ہیں۔ اخلاق واخلاص بہت قیمتی کردار ہیں۔ جس کے وہ حاصل ہیں۔ اس پر طرۂ امتیاز یہ کہ وہ اس فلاحی، اصلاحی آستانے کے پروردہ ہیں۔ اور اسی آستانے کے زیر سایہ نشیب وفراز دیکھے ہیں۔ سلطان الاولیاء حضرت خواجہ بندہ نواز گیسودرازؒ نے اردو میں نثر نگاری کر کے اردو زبان پر ایک احسان عظیم فرمایا۔ انھوں نے پہلی نثر نگاری سے زبان اردو کو طور طریقہ اور قلم کو سلیقہ عطا کیا۔ محبّ کوثر کو فکری کاوشوں میں وہ غزل ہو یا نظم نعت مقدس یا منقبت شریف اسی آستانے کے فیوض وبرکات کے اُسترن کا عکس جھلکتا ہوا نظر آتا ہے۔ اسی لیے ان کے یہاں روایتوں اور کلاسک رویے کا احترام اور عصری تقاضوں کا اہتمام بھی ہے۔ ان کے کلام میں برجستگی کے ساتھ معنوی حسن کا اظہار پختگی اور شگفتگی اک جان دو قالب نظر آتی ہے۔ ان کی پاکیزگی طبع سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

محبّ کوثر مختلف اصناف سخن پر طبع آزمائی کرتے رہے ہیں۔ لیکن ان کی محبوب صنف غزل ہی رہی ہے۔ آج کی ادبی کشمکش کو وہ بھی محسوس کر رہے ہیں۔

سود و زیاں کی زد پہ ہے کوثر غزل
بازار فن سے کیا سبھی اہل ہنر گئے
ہے جہالت کا تماشا علم کے بازار میں
رحم کے قابل ہے دانائی کسے آواز دوں

میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ غزل میں ایسی صلاحیت موجود ہے کہ وہ خود کو زمانے کی ضرورتوں کے مطابق ڈھال لے۔ محبّ کوثر کے یہاں دیکھئے غزل کس رنگ میں خود کو ڈھال رہی ہے۔

کھلونوں سے بہلنا چھوڑ دے گی
ہماری نسل کو تلوار دینا
جنم ہم نے لیا ہے موج و گرداب و تلاطم میں
زمانہ جانتا ہے ہم حوادث ہی کے پالے ہیں

گھر کر گئیں مزاج میں ایزاء پسندیاں
صحراء کی تیز دھوپ میں سائے برے لگے
اس دور جنوں خیز میں ہر چیز ہے ارزاں
اس دور کے بازار مین دھوکہ بھی بہت ہے

غالبؔ نے اپنے اشعار سے قارئین کو خوب خوب ذہنی قلابازیاں کھلائیں مگر ایک وقت ایسا بھی آیا جب انھیں کہنا پڑا۔

بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

غالبؔ ہی نہیں ہر شاعر اس بات کو اچھی طرح سمجھتا ہے کہ زلف ورخ شیشہ وجام کے بغیر غزل کی تکمیل نہیں ہوسکتی۔محبّ کوثر کے یہاں دیکھئے اس کی تکمیل کس طرح ہوتی ہے۔

مجھ سے کبھی تو مل میرے اشعار بھی تو سن
میرا کلام صرف رسالوں میں دیکھ مت
تصور ان کو ہرم ڈھونڈھتا ہے
بھری محفل سے اٹھ کر جو گئے ہیں
میں نے تو ترک محبت کی قسم کھائی ہے
تم بھی آؤ تو ذرا ذرا رائے بدل کراؤ

محبّ کوثرؔ ایک کہنہ مشق شاعر ہیں۔ وہ غزل کے مطالبات کو خوب سمجھتے ہیں۔اس کی لطافت اور نزاکت سے آشنا ہیں۔اس لیے ان کی کوشش یہی رہی ہیں۔کہیں وہ اپنے فرض سے بحسن وخوبی عہدہ براہوسکیں۔محبّ کوثر نے لغت گوئی میں خوب خوب طبع آزمائی کی ہے۔اور جو کچھ کہا ہے وہ پورے اخلاص واحترام اور پوری احتیاط کے ساتھ کہا ہے۔بہت سارے اشعار ایسے ہیں۔جس میں انھوں نے نئے زاویے نکالے ہیں۔

☆☆☆